وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا

(سورۃ الحشر: ۷)

جمہوری نظام

قوموں کے لیے تباہ کن ہے؟



افاداتِ

حضرت مولانا سید مفتی مختار الدین صاحب مدظلہ کربوغہ شریف

خلیفہ مجاز برکۃ العصر شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ

جمع و ترتیب

ملا محمد موسیٰ مجاہد المدنی حفظہ اللہ تعالیٰ ورعاہ

مکتب
اسرار العروج

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس مجموعہ کو حضرت مفتی سید مختارالدین شاہ صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ ورعاہُ کے لیے صدقہ جاریہ، پڑھنے والوں کے لیے ذریعہ ہدایت اور مرتب کے لیے توشہ آخرت بنائے، آمین

الفقیر إلی اللہ تعالٰی، الغریب عن وطنه

ملا محمد موسیٰ مجاھد افغانی ثم المدنی

ردّہ اللہُ إلی بلدہ سالماً معافیً بمنّہ وکرمہ



جمہوری نظام قوموں کے لیے تباہ کن ہے

۱: یہ تو ظاہر ہے کہ جمہوری حکومت کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے، اس میں پارلیمانی ممبروں، وزیروں اور صدر کی مدتِ حکومت زیادہ سے زیادہ پانچ سال ہوتی ہے، اور پاکستان میں تو اکثر پانچ سال سے پہلے پہلے دوڈھائی سال میں جمہوری حکومت دم توڑ دیتی ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر پارلیمانی ممبر، وزیر اور صدر انتخابات جیتنے میں لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کرتا ہے، جو لوگ اس قدر خطیر رقم خرچ کر کے ممبر بنناچاہتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ اپنے مال وجاہ میں اضافہ کریں، ان میں ایسے لوگوں کا وجود نایاب ہوتا ہے جو خالصتاً خدمتِ خلق کا جذبہ لے کر اٹھے ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ اس نظام میں جو شخص ممبر، وزیر وغیرہ بنتا ہے تو وہ سب سے پہلے اپنا نقصان پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، کیونکہ وہ یہی سوچتا ہے کہ لاکھوں کروڑوں روپیہ جیب سے خرچ کر کے بمشکل اس مقام پر پہنچا ہوں، اب اگر اس قلیل مدت میں حقیقی معنوں میں کوئی اصلاحی کام کروں گا تو کمائی کا سارا وقت تو اس میں چلا جائے گا اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ اس تھوڑی سی مدت میں قوم وملت کی کوئی خاطر خواہ خدمت نہیں کر سکتا اور نہ وہ اقتصادی معاشی اصلاحات اور عوام کی بھلائی و بہبود کے کسی منصوبے کو اٹھا کر پورا کر سکتا ہے، اس لیے ان کا کام صرف یہی رہ جاتا ہے کہ وہ مال ودولت، زروزمین اور پلاٹوں کو جمع کرنے میں لگ کر لوٹ لیتے ہیں ان کی اس لوٹ مار کی وجہ سے صرف حکومت کے وہ خزانے ہی خالی نہیں ہوتے جن میں ہر سال ٹیکسوں کے ذریعے عوام کا خون چوس کر کھربوں روپے جمع ہوتے رہتے ہیں، بلکہ اربوں کھربوں روپیہ قرضے سود پر لے کر پوری قوم وملت کو گروی کر کے غلام بنادیتے ہیں۔

۲: جمہوری نظام کبھی مستحکم، مستقل اور پائیدار اصولوں پر نہیں چلتا، روز روز اس کا رنگ بدلتا رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس نظام میں کوئی ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کر سکتا کہ ان کی جو دوستی یا جو پالیسی ہے وہ کل بھی قائم رہے گی؟ یہی وجہ ہے کہ ہر دوڈھائی یا زیادہ سے زیادہ پانچ سال کے بعد ملک کا فکری اور نظریاتی نقشہ یکسر بدلتا رہتا ہے، اس اکھاڑ پچھاڑ اور بے اعتمادی سے قوموں اور ملکوں میں جو بے ایمانی اور کمزوریاں رونما ہوتی ہیں وہ کسی پر پوشیدہ نہیں۔ اس کے برعکس اسلامی طرزِ حکومت میں سربراہِ مملکت اور حکمرانوں کو یہ خطرہ ہر گز نہیں ہوتا کہ ان کی مدت ختم ہورہی ہے کیونکہ اسلامی طرزِ حکومت کے

لیے یہ ضروری نہیں کہ دو چار یا پانچ سال کے بعد انتخابات ہوں اور نئے نئے سربراہ اور وزراء منتخب ہو کر میدان میں آئیں، بلکہ ان کے لیے ضروری یہ ہوتا ہے کہ وہ عدل وانصاف اور شریعتِ مُطَھَّرہ پر قائم رہیں، ان کے لیے اگر کوئی خطرہ ہوتا ہے تو یہی کہ ان کا کوئی کام اور کوئی فیصلہ عدل وانصاف اور شریعتِ مُطَھَّرہ کے خلاف نہ ہو تاکہ وہ شرعی نقطہ نگاہ سے نااہل ہو کر معزول نہ ہو جائیں اس لیے وہ ہمیشہ عدل وانصاف اور شریعت پر قائم رہتے ہیں اور ہر وقت ملک وقوم کی ترقی اور اپنی رعایا کی بھلائی وبہبود اور ان کی اصلاح وتربیت میں یکسوئی کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔

۳: انتخابی مہم میں جو اسراف وتبذیر ہوتا ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں، گاڑیوں کی قطاروں، جلسے جلوسوں اور اشتہارات پر ایک ایک امیدوار لاکھوں روپیہ خرچ کرتا ہے۔ یہ تمام امور شرعاً ناجائز وحرام بھی ہیں، اور ان کا یہی اسراف وتبذیر ملک اور قوم کی تباہی وبربادی کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

جمہوری نظام بے نقاب ہو رہا ہے [1]

دنیا کے سیاسی نظریوں میں جس قدر پُر فریب نظریہ مُرَوَّجہ جمہوری نظام ہے اس قدر کوئی بھی نہیں، اس نے ایسا دلکش اور خوشنما نقاب اپنے چہرے پر ڈال رکھا ہے کہ وہ بظاہر تو عام انسانوں کے لیے ایک جنت اور بہت خوش کن نظر آتا ہے، مگر اس کا اصل چہرہ جہنم، بہت گھناؤنا اور ہیبت ناک ہے۔ اس کا ظاہری نقاب تو یہی بتلا رہا ہے کہ اس نظام میں کسی فقروفاقے، غربت، خوف وغم اور غلامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن اس کا باطن جو سرمایہ پرستی، خود غرضی، کفرونفاق، سنگدلی اور ظلم کی لعنت سے رچا بسا ہے وہ پوری انسانیت کو کند چھری سے اس قدر بے دردی سے ذبح کر رہا ہے اور پوری انسانیت کو ہلاکت وبربادی کے گڑھوں میں اس طرح دھکیل رہا ہے کہ ابتدائے عالم سے انسانیت اس طرح ہلاکت وبربادی اور دجل وفریب کی کبھی شکار نہیں ہوئی تھی۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تاریک تر
(اقبال از فغان حجاز)

ملا محمد موسیٰ مجاہد عفی عنہ

---

[1] یہ اس وقت کی بات ہے جب کتاب لکھی جا رہی تھی آج تو بے نقاب ہو چکا ہے۔ (زین)

بندہ نے تقریباً دس سال پہلے ۱۴۰۸ھ میں ایک اجتماع میں جمہوری نظام کے بطلان اور غیر اسلامی ہونے کو سامنے لایا تو اس وقت بہت سے علما پر یہ بات بہت گراں گزری اور ان کا خیال یہ تھا کہ گویا میں ایک ایسی بات کہہ رہا ہوں جو بالکل اسلام کے خلاف ہے، لیکن بات چونکہ مُدلّل اور واضح تھی اس لیے اِدھر اُدھر کی باتوں کے سوا ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان حضرات کو یقین تھا کہ آج یہی وہ واحد راستہ ہے جس سے اسلامی نظام نافذ ہو سکتا ہے اس لیے ان کو جمہوریت کی حقانیت پر پورا یقین تھا، لیکن الحمد اللہ اب ایسا وقت آچکا ہے اور آرہا ہے کہ جمہوریت کا خوشنما اور دلکش پُر فریب نقاب اٹھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کے عملی فیصلے اور تجربہ ثابت کر رہا ہے کہ عام انسانی دنیا اس سے پہلے کبھی اس قدر ہلاکت و بربادی کا شکار نہیں ہوئی تھی جتنی اس منافقانہ اور فریبانہ جمہوریت سے برباد ہوگئی۔ اس سے قطعاً صحیح نتائج برآمد ہو ہی نہیں سکتے، بلکہ جمہوریت کے ملعون اثرات روز بروز دنیا پر چڑھتے ہوئے سورج سے زیادہ عیاں ہو رہے ہیں۔

"سیاستِ اسلامیہ" نامی کتاب میں ماہنامہ "البلاغ" کے حوالے سے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کا ایک مضمون چھپ چکا ہے۔ اس میں جمہوریت سے متعلق جو کچھ لکھا ہے مناسب سمجھتا ہوں کہ اس میں سے یہاں اختصار کے ساتھ کچھ نقل کر دوں۔

اسلام کا نظامِ حکومت

قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے اندر جو شخصی حکومتیں عام طور سے رائج رہی ہیں وہ مطلق العنان بادشاہتیں تھیں جن میں بادشاہ کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی تھی اور اس پر کوئی قانونی قدغن عائد نہیں ہوتی تھی، اس مطلق العنان حکمرانی کے نتیجے میں ظلم و ستم اور ناانصافیوں کا بازار گرم رہا، اس لیے اس کے خلاف یورپ میں شدید رد عمل ہوا "شخصی حکومت" کو بذات خود نہایت معیوب سمجھا جانے لگا اور اس کی جگہ "جمہوریت" کو ایک مثالی طرزِ حکومت کے طور پر پیش کیا گیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ شخصی حکومتیں ختم ہو گئیں اور ان کی جگہ جمہوری نظامِ حکومت وجود میں آیا، بیشتر ملکوں میں جمہوریت قائم کی گئی، یہاں تک کہ جمہوریت کو ایک ایسا فیشن ایبل نظامِ حکومت سمجھا جانے لگا جو سیاست میں عدل و انصاف اور حق و صداقت کا ضامن ہے، چنانچہ گزشتہ (ہجری) صدی سے لے کر اب تک جتنی سیاسی تحریکیں اُٹھی ہیں،

اُن کے ذہن میں جمہوریت کی حیثیت (معاذ اللہ) ایک ایسے "کلمہ طیبہ" کی ہو گئی ہے جس کے بغیر آج کے دور میں سیاست کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

دنیا بھر پر چھائے ہوئے اس پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہدِ حاضر میں جو سیاسی جماعتیں اسلام کا نام لے کر اُٹھی ہیں، ان کی اکثریت بھی نہ صرف یہ کہ جمہوریت کو ایک مُسلَّم اُصول قرار دے کر آگے بڑھی ہے، بلکہ انہوں نے بھی اپنے مقاصد میں جمہوریت کے قیام کو سرفہرست رکھا ہے اور خود اپنی جماعت کو بھی جمہوری ڈھانچے پر تعمیر کیا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ دعوے بھی بکثرت کیے گئے ہیں کہ جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے، بلکہ اسلام نے جمہوریت ہی کی تعلیم دی ہے، کسی نے بہت احتیاط کی تو یہ کہہ دیا کہ جمہوریت کے جو اجزاء اسلام کے خلاف ہیں، ہم ان کے قائل نہیں ہیں، لہٰذا ہماری جمہوریت "اسلامی جمہوریت" ہے۔

یہ تصورات ہمارے دور میں اس قدر مشہور ہو گئے ہیں کہ ان کے خلاف کچھ سوچنا یا کہنا دنیا بھر کی لعنت و ملامت کو اپنے سر لینے کے مترادف ہے، اور اگر ایسے ماحول میں کوئی شخص جمہوری حکومت کے بجائے شخصی حکومت کی حمایت کرے تو ایسا شخص تو آج کی سیاسی فضا میں تقریباً کلمۂ کفر کہنے کا مرتکب سمجھا جانے لگا ہے، لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور خاص دین کی دعوت و تجدید کے لیے منتخب فرمایا ہو، وہ زمانے پر چھائے ہوئے تصورات اور خوشنما نعروں سے مرعوب و متاثر نہیں ہوتا، بلکہ ہر حال میں حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دیتا ہے، چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ تسلیم نہیں فرمایا کہ اسلام نے جمہوریت کی تعلیم دی ہے یا جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے، اس کے بجائے انہوں نے اپنے متعدد مواعظ و ملفوظات و تصانیف میں جمہوریت پر نہایت جاندار تنقیدیں کی ہیں اور اپنے دینی نقطۂ نظر سے اس کی خرابیوں کو واضح فرمایا ہے۔

عام طور سے جمہوریت کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں صرف اتنا خیال رہا کہ مطلق العنان بادشاہت کے مقابلے میں یہ نظام عوام کو آزادی اظہارِ رائے عطا کرتا ہے اور حکمرانوں پر ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے جن کے ذریعے وہ بے مہار نہ ہو سکیں۔ اور چونکہ اسلام نے "مشاورت" کا حکم دیا ہے، اس لیے "جمہوریت" کو "مشاورت" کے ہم معنی سمجھ کر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ "جمہوریت" عین اسلام

ہے۔حالانکہ بات اتنی سادہ نہیں ہے، درحقیقت ”جمہوری نظامِ حکومت“ کے پیچھے ایک مستقل فلسفہ ہے جو دین کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، اور جس کے لیے سیکولرزم پر ایمان لانا تقریباً لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

جمہوریت کی حقیقت واضح کرنے کے لیے یہ جملہ مشہور ہے:

(IT IS A GOVERNMENT OF THE PEOPLE

BY THE PEOPLE FOR THE PEOPLE)

”جمہوریت عوام کی حکومت کا نام ہے جو عوام کے ذریعے اور عوام کے فائدے کے لیے قائم ہوتی ہے“۔

لہٰذا ”جمہوریت“ کا سب سے پہلا رکنِ اعظم یہ ہے کہ اس میں عوام کو حاکمِ اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے اور عوام کا ہر فیصلہ جو کثرتِ رائے کی بنیاد پر ہوا ہو وہ واجب اور ناقابلِ تنسیخ سمجھا جاتا ہے، کثرتِ رائے کے اس فیصلے پر کوئی قدغن اور کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی، اگر دستور حکومت عوامی نمائندوں کے اختیار قانون سازی پر کوئی پابندی بھی عائد کردے (مثلاً یہ کہ وہ کوئی قانون قرآن وسنت کے یا بنیادی حقوق کے خلاف نہیں بنائے گی) تو یہ پابندی اس لیے واجب التعمیل نہیں ہوتی کہ یہ عوام سے بالاتر کسی اتھارٹی نے عائد کی ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جسے ہر حال میں ماننا ضروری ہے، بلکہ صرف اس لیے واجب التعمیل سمجھی جاتی ہے کہ یہ پابندی خود کثرتِ رائے نے عائد کی ہے، لہٰذا اگر کثرتِ رائے کسی وقت چاہے تو اسے منسوخ بھی کرسکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جمہوریت نے کثرتِ رائے کو (معاذاللہ) خدائی کا مقام دیا ہوا ہے کہ اس کا کوئی فیصلہ رد نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ اسی بنیاد پر مغربی ممالک میں بد سے بدتر قوانین کثرتِ رائے کے زور پر مسلسل نافذ کیے جاتے رہے ہیں، اور آج تک نافذ کیے جارہے ہیں زنا جیسی بدکاری سے لے کر ہم جنس جیسے گھناؤنے عمل تک کے آخری سے تک پہنچادیا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے کثرتِ رائے کے اس جمہوری فلسفے پر جابجا تبصرے فرماکر اس کی کمزوری کو واضح کیا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

"اور اگر آپ زمین والوں کی اکثریت کی اطاعت کریں گے تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے گمراہ کردیں گے"۔

کثرتِ رائے کو معیارِ حق قرار دینے کے خلاف اس سے زیادہ واشگاف اعلان اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن زمانے پر چھائے ہوئے نظریات سے مرعوب ہو کر مسلمانوں میں بھی یہ خیال تقویت پا گیا کہ جس طرف کثرتِ رائے ہوگی وہ بات ضرور حق ہوگی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے اپنی تالیفات اور مواعظ وملفوظات میں بہت سے مقامات پر اس پھیلی ہوئی غلطی کی تردید فرمائی ہے، ایک وعظ میں فرماتے ہیں:

"آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرتِ رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے، صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے؟ کیا ان عوام کالانعام کی؟ اگر انہی کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا، ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود علیہ السلام ایک طرف، آخر انہوں نے کیوں توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی؟ کیوں تفریقِ قوم کا الزام سر لیا؟ اسی لیے کہ وہ قوم جاہل تھی، اُس کی رائے جاہلانہ رائے تھی۔"

(فضائل العلم والخشیہ ص ۳۰ و معارف حکیم الامت ص ۶۱۷)

مطلب یہ ہے کہ عوام کی کثرتِ رائے کبھی معیارِ حق نہیں ہو سکتی، کیونکہ عوام میں اکثریت عموماً بے علم یا کم علم لوگوں کی ہوتی ہے۔

"(غزوۂ اُحد میں) اُن پچاس آدمیوں میں جو پہاڑ کی گھاٹی پر متعین تھے، اختلاف ہوا، بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے، اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصود کی مخالفت نہ ہوگی، اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ حصہ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہیے، ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں، ہم کو مالِ غنیمت جمع کر لینا چاہیے، بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمادیا تھا کہ بدون میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا، اس لیے ہم کو بدون آپ کی اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا چاہیے، مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہوگئے، یہ اُن سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی

اور ایک افسر اُن کے رہ گئے۔ اس واقعہ میں کثرتِ رائے غلطی پر تھی اور قلتِ رائے صواب پر تھی، جو لوگ کثرتِ رائے کو علامتِ حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں۔"

(ذم النسیان ص ۱۲، معارف حکیم الامت ص ۶۱۸)

اسی وعظ میں آگے چل کر حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے کثرتِ رائے کی لازمی حقانیت کے خلاف حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے اس طرزِ عمل کی مثال بھی دی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو ان کے خلاف آپ نے جہاد کا ارادہ فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمیت بیشتر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے یہ تھی کہ ان لوگوں کے ساتھ جہاد نہ کیا جائے، لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی رائے پر قائم رہے اور اسی کے مطابق فیصلہ بھی ہوا اور بعد میں سب لوگوں نے یہ اعتراف کیا کہ صائب رائے یہی تھی۔

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے کثرتِ رائے کو معیارِ حق قرار دینے کے نظریے پر شرعی اور عقلی دونوں قسم کے دلائل سے تنقید فرمائی ہے اور سادہ سادہ لفظوں میں ایسے حقائق بیان فرما دیے ہیں کہ جب بھی کوئی شخص ٹھنڈے دل سے غور کرے گا اسی نتیجے تک پہنچے گا، چنانچہ جدید علمِ سیاست کے بعض حقیقت پسند ماہرین نے بھی "جمہوریت" کے ان نقائص کو تسلیم کیا ہے۔ ایک مشہور ماہرِ سیاسیات ایڈمنڈ بورک (BURKE) لکھتا ہے:

"اکثریت کے فیصلے کو تسلیم کرنا کوئی فطرت کا قانون نہیں ہے، کم تعداد بعض اوقات زیادہ مضبوط طاقت بھی ہو سکتی ہے، اور اکثریت کی حرص و ہوس کے مقابلے میں اس کے اندر زیادہ معقولیت بھی ہو سکتی ہے، لہٰذا یہ مقولہ: "اکثریت کے فیصلے کو قانون چاہیے"۔ اس میں افادیت اور پالیسی کی بھی اتنی ہی کمی ہے جتنی حقانیت کی" (1)

حکیم الامت قدس سرہٗ ایک اور وعظ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اول تو کثرتِ رائے میں احمقوں کو جمع کیا جاتا ہے، ان کی کثرت تو حماقت ہی کی طرف ہو گی، پھر

---

(1) Quoted by A. Appadorai, The Substance of Politics, Oxford University Press 9th ed. 1961p. 133.

ان سے بھی پہلے اپنی رائے منوالی جاتی ہے اور سبق کی طرح پڑھا دیا جاتا ہے کہ ہم یوں کہیں گے تم یوں کہہ دینا، جیسے وکیل گواہوں کو پڑھایا کرتے ہیں، اب وہ کثرت کیا خاک ہوتی۔"

(وعظ "الانساء" ماخوذ از اصلاح المسلمین ص ۵۱۰ مطبوع ادارہ اسلامیات، لاہور)

بعض جمہوریت پرست لوگوں نے حضرت رحمۃ اللہ کے اس تبصرے کو ایک سطحی تبصرہ قرار دینے کی کوشش کی ہے اور بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ یہ ایک ایسے بزرگ کا تبصرہ ہے جن کا میدان علم سیاست نہیں تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت کی نگاہ اپنی گوشہ نشینی کے باوجود زمانے کی دُکھتی ہوئی رگوں پر ہوتی تھی، ان کا اصل ماٗخذ قرآن وسنت تھے اور وحی کی اسی روشنی نے اُنہیں وہ نورِ فراست عطا فرمادیا تھا جس کے ذریعے وہ ان مسائل کو انتہائی سادگی سے بیان فرما گئے ہیں جن کو لوگوں نے ایک مستقل فلسفہ بنا رکھا ہے، چنانچہ یہ تبصرہ بھی اسی فراستِ ایمانی کا نتیجہ تھا، علم سیاست بے شک آپ کا اصل میدان نہیں تھا، لیکن جو سچائی وحی کے نور سے معلوم ہوئی ہو اُسے رسمی علوم کی حاجت نہیں ہوتی۔

لیکن اس علمِ سیاست کے وہ ماہرین بھی جنہوں نے پروپیگنڈے سے ذرا آزاد ہو کر سوچنے کی کوشش کی ہے وہ بھی بالآخر اسی نتیجے تک پہنچے ہیں۔

ڈاکٹر اے ابادورائے برصغیر میں اپنی سیاسی تصانیف کی وجہ سے خاص مشہور ہیں وہ "جمہوریت" کے تعارف اور اس کی کامیابی کی شرائط پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

"جمہوریتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ شرائط (جن کے وجود پر جمہوریت کی کامیابی موقوف ہے) شاذ ونادر ہی پوری ہوئی ہیں، عملی اعتبار سے جمہوریت دراصل جہالت کی حکمرانی کا نام ہے، اس کی ساری توجہ کمیت اور تعداد (Quantity) پر رہتی ہے۔ کیفیت (Quality) پر نہیں۔ اس میں ووٹ گنے جاتے ہیں انہیں تولا نہیں جاتا، شہریوں کی بہت بڑی تعداد کی اب بھی حکومت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی، وہ کام کرتی اور کھیلتی رہتی ہے فصلیں کاٹتی اور انہیں بیچتی رہتی ہے، اور یہ بھول جاتی ہے کہ وہ دراصل ملک کی حاکم ہے، جمہوریت میں یہ حقیقی خطرہ موجود ہے کہ شہریوں کی ایسی ذہنی تربیت نہیں ہو پاتی جس کے ذریعہ وہ ان مسائل کے حقیقی مفہوم کا ادراک کر سکیں جو انتخاب کے موقع پر ان کے سامنے فیصلے کے لیے آتے ہیں، لہٰذا وہ طبقاتی جذبات اور نعروں سے گمراہ ہو سکتے ہیں۔ سر ہنری مین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ

جمہوریت کبھی بھی اکثریت کی حکمرانی کی نمائندگی نہیں کرسکتی، کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ عوام تو محض اپنے لیڈروں کی آراء کو تسلیم کرتے ہیں۔"① (سیاست اسلامیہ ــــــ ۶۵)

میں اس کتاب کو مکمل کر چکا تھا کہ حضرت مولانا فضل محمد صاحب زید مجدہم کی ایک کتاب "فتنۂ ارتداد اور جہاد فی سبیل اللہ" نامی ہاتھ لگ گئی، اس کتاب میں انہوں نے جمہوریت کے اصل چہرے کو بے نقاب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اور کتاب کے اس مضمون میں انہوں نے جمہوریت کے بارے حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ کی رائے بھی پیش کی ہے میں نے مناسب سمجھا کہ اس مضمون میں سے کچھ یہاں پیش کروں۔

جمہوریت اور حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی کی رائے

حضرت علامۃ العصر عارف کامل حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہ نے بینات کے پرچے شعبان ۱۴۱۰ھ کے شمارے میں جمہوریت کے متعلق ایک پر مغز مضمون شائع کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا "جمہوریت دورِ جدید کا صنمِ اکبر" میں اس مضمون کو من وعن یہاں درج کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ قارئین حضرات اس سے لطف بھی اٹھائیں گے اور اس کے تقاضے بھی پورے فرمائیں گے۔

جمہوریت دورِ جدید کا صنمِ اکبر

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِینَ اصطَفٰی! اَمَّا بَعدُ:

بعض غلط نظریات قبولیتِ عامہ کی ایسی سند حاصل کر لیتے ہیں کہ بڑے بڑے عقلاء اس قبولیتِ عامہ کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں وہ یا تو ان غلطیوں کا ادراک ہی نہیں کر پاتے یا اگر ان کو غلطی کا احساس بھی ہو جائے تو اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتے۔ دنیا میں جو بڑی بڑی غلطیاں رائج ہیں ان کے بارے میں اہلِ عقل اسی المیہ کا شکار ہیں، مثلاً بت پرستی کو لیجیے خدائے وحدہٗ لاشریک کو چھوڑ کر خود تراشیدہ پتھروں اور مورتیوں کے آگے سربسجود ہونا کس قدر غلط اور باطل ہے، انسانیت کی اس سے بڑھ کر توہین وتذلیل کیا ہوگی کہ انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے بے جان مورتیوں کے سامنے سرنگوں کر دیا

① (A. Appadorai, op cit p. 133.)

جائے اور اس سے بڑھ کر ظلم کیا ہو گا کہ حق تعالیٰ شانہ' کے ساتھ مخلوق کو شریکِ عبادت کیا جائے ، لیکن مشرک برداری کے عقلا کو دیکھو کہ وہ خود تراشیدہ پتھروں، درختوں، جانوروں وغیرہ کے آگے سجدہ کرتے ہیں، تمام تر عقل ودانش کے باوجود ان کا ضمیر اس کے خلاف احتجاج نہیں کرتا اور نہ وہ اس میں کوئی قباحت محسوس کرتے ہیں۔

اسی غلط قبولیتِ عامہ کا سکہ آج جمہوریت میں چل رہا ہے۔ جمہوریت دورِ جدید کا وہ "صنمِ اکبر" ہے جس کی پرستش اول اول دانایانِ مغرب نے شروع کی، چونکہ وہ آسمانی ہدایت سے محروم تھے اس لیے ان کی عقل نارسانے دیگر نظام ہائے حکومت کے مقابلہ میں جمہوریت کا بُت تراش لیا اور پھر اس کو مثالی طرزِ حکومت قرار دے کر اس کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ پوری دنیا میں اُس کا غلغلہ بلند ہوا یہاں تک کہ مسلمانوں نے بھی تقلیدِ مغرب میں جمہوریت کی مالا جپنی شروع کر دی، کبھی یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ "اسلام جمہوریت کا علمبردار ہے"۔ اور کبھی "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح وضع کی گئی۔ حالانکہ مغرب جس بُت کا پجاری ہے، اس کا نہ صرف یہ کہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی ضد ہے اس لیے اسلام کے ساتھ جمہوریت کا پیوند لگانا اور جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کرنا صریحاً غلط ہے۔

سب جانتے ہیں کہ اسلام نظریہ خلافت کا داعی ہے جس کی رو سے اسلامی مملکت کا سربراہ آنحضرت ﷺ کے خلیفہ اور نائب کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی زمین پر احکامِ الٰہیہ کے نفاذ کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے، چنانچہ مسند الہند حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں :

مسئلہ در تعریف خلاف: ھی الریاسة العامة فی التصدی لا قامة الدین باحیاءِ العلوم الدینیة واقامة ارکان الاسلام والقیام بالجهاد وما یتعلق بہ من ترتیب الجیوش والفرض للمقاتلة واعطائهم من الفیئ والقیام بالقضاءِ واقامة الحدود ورفع المظالم والامر بالمعروف والنهی عن المنکر نیابةً عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ازالۃ الخفاء ص ۲)

"خلافت کے معنی ہیں آنحضرت ﷺ کی نیابت میں دین کو قائم (اور نافذ) کرنے کے لیے مسلمانوں کا سربراہ بننا اور اقامتِ دین کے ذرائع مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ دینی علوم کو زندہ رکھنا۔

۲۔ ارکانِ اسلام کو قائم کرنا۔

۳۔ جہاد کو قائم کرنا اور متعلقاتِ جہاد کا انتظام کرنا، مثلاً لشکروں کا مرتب کرنا، مجاہدین کو وظائف دینا اور مالِ غنیمت ان پر تقسیم کرنا۔

۴۔ قضاء عدل کو قائم کرنا، حدودِ شرعیہ کو نافذ کرنا اور مظالم کو رفع کرنا۔

۵۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا۔"

اس کے برعکس جمہوریت میں عوام کی نمائندگی کا تصور کار فرما ہے، چنانچہ جمہوریت کی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے۔

"جمہوریت وہ نظامِ حکومت ہے جس میں عوام کے چنے ہوئے نمائندوں کی اکثریت رکھنے والی سیاسی جماعت حکومت چلاتی ہے اور عوام کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔"

گویا اسلام کے نظامِ خلافت اور مغرب کے تراشیدہ نظامِ جمہوریت کا راستہ پہلے ہی قدم پر الگ الگ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ:

۱۔ خلافت، رسول اللہ ﷺ کی نیابت کا تصور پیش کرتی ہے اور جمہوریت عوام کی نیابت کا نظریہ پیش کرتی ہے۔

۲۔ خلافت مسلمانوں کے سربراہ پر اقامتِ دین کی ذمہ داری عائد کرتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ کا دین قائم کیا جائے، اور اللہ تعالیٰ کے بندوں پر اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نظامِ عدل کو نافذ کیا جائے، جب کہ جمہوریت کو نہ خدا اور سول سے واسطہ ہے۔ نہ دین اور اقامتِ دین سے کوئی غرض ہے، اس کا کام عوام کی خواہشات کی تکمیل ہے، اور وہ ان کے منشا کے مطابق قانون سازی کی پابند ہے۔

۳۔ اسلام، منصبِ خلافت کے لیے خاص شرائط عائد کرتا ہے، مثلاً مسلمان ہو، عاقل وبالغ ہو، سلیم الحواس ہو، مرد ہو، عادل ہو، احکام شرعیہ کا عالم ہو۔ جب کہ جمہوریت ان شرائط کی قائل نہیں، جمہوریت یہ ہے کہ جو جماعت بھی عوام کو سبز باغ دکھا کر اسمبلی میں زیادہ نشستیں حاصل کرلے۔ اسی کو عوام کی نمائندگی کا حق ہے، جمہوریت کو اس سے بحث نہیں کہ عوامی اکثریت حاصل کرنے والے ارکان مسلمان ہیں یا کافر، نیک

ہیں یا بد، متقی وپرہیز گار ہیں یا فاجر وبدکار، احکام شرعیہ کے عالم ہیں یا جاہل مطلق اور لائق ہیں یا کندۂ ناتراش۔

الغرض جمہوریت میں عوام کی پسند وناپسند ہی سب سے بڑا معیار ہے اور اسلام نے جن جن اوصاف وشرائط کا کسی حکمران میں پایا جانا ضروری قرار دیا، وہ عوام کی حمایت کے بعد سب لغو اور فضول ہیں اور جو نظام سیاستِ اسلام نے مسلمانوں کے لیے وضع کیا ہے، وہ جمہوریت کی نظر میں محض بے کار اور لایعنی ہے۔ نعوذ باللہ

۴۔ خلافت میں حکمران کے لیے بالاتر قانون کتاب وسنت ہے اور اگر مسلمانوں کا اپنے حُکّام کے ساتھ نزاع ہو جائے تو اس کو اللہ ورسول کی طرف رد کیا جائے گا اور کتاب وسنت کی روشنی میں اس کا فیصلہ کیا جائے گا، جس کی پابندی راعی اور رعایا دونوں پر لازم ہو گی۔ جبکہ جمہوریت کا فتویٰ یہ ہے کہ مملکت کا آئین سب سے مُقدّس دستاویز ہے اور تمام نزاعی اُمور میں آئین ودستور کی طرف رجوع لازم ہے حتیٰ کی عدالتیں بھی آئین کے خلاف فیصلہ صادر نہیں کر سکتیں، لیکن ملک کا دستور اپنے تمام تر تقدّس کے باوجود عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ کا کھلونا ہے، وہ مطلوبہ اکثریت کے بل بوتے پر اس میں جو چاہیں ترمیم وتنسیخ کرتے پھریں، پھر اُن کو کوئی روکنے والا نہیں اور مملکت کے شہریوں کے لیے جیسا قانون چاہیں بنا ڈالیں، کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں، یاد ہو گا کہ انگلینڈ کی پارلیمنٹ نے دو مردوں کی شادی کو قانوناً جائز قرار دیا تھا، اور کلیسا نے اس کے فیصلے کو صادر کر دیا تھا، چنانچہ عملاً دو مردوں کا کلیسا کے پادری نے نکاح پڑھایا۔ نعوذ باللہ

حال ہی میں پاکستان کی ایک محترمہ کا بیان اخبارات کی زینت بنا تھا کہ جس طرح اسلام نے ایک مرد کو بیک وقت چار عورتوں سے شادی کی اجازت دی ہے، اسی طرح ایک عورت کو بھی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ بیک وقت چار شوہر رکھ سکے۔ ہمارے یہاں جمہوریت کے نام پر مرد وزن کی مساوات کے جو نعرے لگ رہے ہیں، بعید نہیں کہ جمہوریت کا نشہ کچھ تیز ہو جائے اور پارلیمنٹ میں یہ قانون بھی زیرِ بحث آجائے۔

ابھی گزشتہ دنوں پاکستان ہی کے ایک بڑے مفکر کا مضمون اخبار میں شائع ہوا تھا کہ شریعت کو پارلیمنٹ سے بالاتر قرار دینا قوم کے منتخب نمائندوں کی توہین ہے، کیونکہ قوم نے اپنے منتخب نمائندوں کو قانون سازی کا مکمل اختیار دیا ہے، ان صاحب کا یہ عندیہ جمہوریت کی صحیح تفسیر ہے جس کی رو سے قوم کے منتخب نمائندے شریعتِ الٰہی سے بھی بالاتر قرار دیے گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں ”شریعت بل“

کئی سال سے قوم کے منتخب نمائندوں کا منہ تک رہا ہے، لیکن آج تک اسے شرفِ پذیرائی حاصل نہیں ہو سکا، اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام مغربی جمہوریت کا قائل ہے۔

۵۔ تمام دنیا کے عقلا کا قاعدہ ہے کہ کسی اہم معاملہ میں اس کے ماہرین سے مشورہ لیا جاتا ہے، اسی قاعدے کے مطابق اسلام نے انتخابِ خلیفہ کی ذمہ داری اہلِ حل وعقد پر ڈالی ہے جو رموزِ مملکت کو سمجھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ اس کے لیے موزوں ترین شخصیت کون ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا۔اِنَّما الشوریٰ للمهاجرینَ وَالا نصارِ یعنی: خلیفہ کے انتخاب کا حق صرف مہاجرین وانصار کو حاصل ہے۔

لیکن بت کدۂ جمہوریت کے برہمنوں کا فتویٰ یہ ہے کہ حکومت کے انتخاب کا حق ماہرین کو نہیں، بلکہ عوام کو ہے۔ دنیا کا کوئی کام اور کوئی منصوبہ ایسا نہیں جس میں ماہرین کے بجائے عوام سے مشورہ لیا جاتا ہو، کسی معمولی سے معمولی ادارے کو چلانے کے لیے ماہرین سے مشورہ طلب کیا جاتا ہے، لیکن یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ حکومت کا ادارہ (جو تمام اداروں کی ماں ہے اور مملکت کے تمام وسائل جس کے قبضہ میں ہیں، اس کو) چلانے کے لیے ماہرین سے نہیں، بلکہ عوام کی رائے لی جاتی ہے، حالانکہ عوام کی ننانوے فیصد اکثریت یہی نہیں جانتی کہ حکومت کیسے چلائی جاتی ہے، اس کی پالیسیاں کیسے مرتب کی جاتی ہیں اور حکمرانی کے اُصول وآداب اور نشیب وفراز کیا کیا ہیں؟ ایک حکیم ودانا کی رائے کو ایک گھسیارے کی رائے کے ہم وزن شمار کرنا اور ایک کندۂ ناتراش کی رائے کو ایک عالی دماغ مدبّر کی رائے کے برابر قرار دینا یہ وہ تماشا ہے جو دنیا کو پہلی بار جمہوریت کے نام دکھایا گیا ہے۔

درحقیقت "عوام کی حکومت عوام کے لیے اور عوام کے مشورے" کے الفاظ محض عوام کو الو بنانے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جمہوریت میں نہ تو عوام کی رائے کا احترام کیا جاتا ہے اور نہ عوام کی اکثریت کے نمائندے حکومت کرتے ہیں، کیونکہ جمہوریت میں اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی کہ عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کون کون سے نعرے لگائے جائیں گے اور کن کن ذرائع کو استعمال کیا جائے گا، عوام کی ترغیب وتحریض کے لیے جو ہتھکنڈے بھی استعمال کیے جائیں، ان کو گمراہ کرنے کے لیے جو سبز باغ بھی دکھائے جائیں، اور انہیں فریفتہ کرنے کے لیے جو ذرائع بھی استعمال کیے

جائیں وہ جمہوریت میں سب روا ہیں۔ اب ایک شخص خواہ کیسے ہی ذرائع اختیار کر کے اپنے حریفوں کے مقابلے میں زیادہ ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے وہ "عوام کا نمائندہ" شمار کیا جاتا ہے، حالانکہ عوام بھی جانتے ہیں کہ اس شخص نے عوام کی پسندیدگی کی بنا پر زیادہ ووٹ حاصل نہیں کیے، بلکہ روپے پیسے سے ووٹ خریدے ہیں، دھونس اور دھاندلی کے حربے استعمال کیے ہیں، اور غلط وعدوں سے عوام کو دھوکا دیا ہے، لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود یہ شخص نہ روپے پیسے کا نمائندہ کہلاتا ہے، نہ دھونس اور نہ دھاندلی کا منتخب نمائندہ اور نہ جھوٹ، فریب اور دھوکہ دہی کا نمائندہ شمار کیا جاتا ہے، چشم بد دور! یہ قوم کا نمائندہ کہلاتا ہے۔ انصاف کیجیے کہ "قوم کا نمائندہ" اسی قماش کے آدمی کو کہا جاتا ہے؟ اور کیا ایسے شخص کو ملک وقوم سے کوئی ہمدردی ہو سکتی ہے...... الغرض جمہوریت کے عنوان سے "عوام کی حکومت عوام کے لیے" کا دعویٰ محض ایک فریب ہے اور اسلام کے ساتھ اس کی پیوند کاری فریب در فریب ہے، اسلام کا جدید جمہوریت سے کوئی تعلق نہیں، نہ جمہوریت کو اسلام سے کوئی واسطہ ہے۔

ضدان لایجتمعان- وَصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ

صفوۃ البریۃ محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

بینات شعبان ۱۴۱۰ھ

ملا محمد موسیٰ مجاہد عفی عنہ